سود کے جواز کے لیے حیلے

ایک جائزہ

مولانا گوہر رحمٰن ○

انسان جب کسی چیز کا عادی ہو جاتا ہے تو اسے چھوڑنا اس کے لیے بڑا مشکل ہوتا ہے۔ یہی حال سود کا ہے۔ لوگ سودی کاروبار کے عادی بن چکے ہیں' اور اس میں مہارت اور تجربہ حاصل کر چکے ہیں' اس لیے حیلوں بہانوں سے اپنے اس دھندے کو جاری رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قسم قسم کے سودی حیلے تلاش کرتے رہتے ہیں تاکہ نام تجارت کا ہو اور کام سود کا' بورڈ حلال کھانے کا ہو اور ملتا ہو حرام۔ ہر دور کے سود خوروں نے "حیل ربویہ" کے ذریعے اپنا سودی کاروبار چلایا ہے لیکن جدید دور کی سودی معیشت کے ماہرین نے نئے نئے سودی حیلے ایجاد کیے ہیں جن کی حقیقت سے پردہ اٹھانا ضروری ہے۔

حیلے کی حقیقت

حیلے کی حقیقت کیا ہے؟ کیا حیلے کی وجہ سے حرام حلال ہو سکتا ہے' ظلم انصاف بن سکتا ہے اور ناپاک پاک ہو سکتا ہے؟ رسول ؐ اللہ نے فرمایا ہے: "تم وہ جرم نہ کرو جو یہودیوں نے کیا تھا کہ اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حیلوں کے ذریعے حلال سمجھ لو" (فتاویٰ کبریٰ لابن تیمیہ' ج ۳' ص ۱۲۳' طبع ۱۳۸۵ھ وقال اسنادہ جید)۔ لفظ حیلہ اپنے اصل لغوی مفہوم کے اعتبار سے کوئی بری چیز نہیں ہے۔ امام راغب اصفہانیؒ (م ۵۰۲ھ) نے لکھا ہے: "کسی حالت اور مقصد تک پہنچنے کی خفیہ تدبیر کو حیلہ کہا جاتا ہے۔ اس کا اکثر استعمال تو برے کام کے لیے ہوتا ہے مگر یہ اس کام کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جس میں حکمت اور مصلحت ہو" (المفردات فی غریب القرآن ' ص ۱۳۷' طبع ۱۹۶۱)۔ قرآن میں مستضعفین کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَّلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا ○ (النساء ۴:۹۸) جو کسی خفیہ تدبیر کی طاقت نہیں

○ شیخ القرآن والحدیث ' الجامعہ الاسلامیہ تعلیم القرآن' مردان

رکھتے اور نہ ان کو کسی پناہ گاہ تک پہنچنے کا راستہ معلوم ہے---- اس آیت میں ہجرت کی تدبیر کے لیے حیلے کا لفظ استعمال ہوا ہے جو ظاہر ہے کہ نیکی کا کام ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) فرماتے ہیں: ''حیلہ کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے خفیہ راستے کا نام ہے''۔ اس تعریف سے معلوم ہوا کہ اچھے مقصد کے لیے حیلہ کرنا اچھا ہے اور برے مقصد کے لیے حیلہ کرنا برا ہے۔ علامہ بدر الدین عینیؒ نے نسفی کی کتاب الکافی کے حوالے سے امام محمدؒ کا قول نقل کیا ہے: ''یہ مسلمانوں کے اخلاق میں شامل نہیں ہے کہ وہ حق کے ابطال کے لیے حیلے کریں اور اللہ کے احکام سے فرار اختیار کریں'' (عمدۃ القاری شرح بخاری' کتاب الحیل)۔

امام محمدؒ کے شاگرد ابو حفص کبیر نے اپنے شیخ کا قول اس طرح نقل کیا ہے: ''جس حیلے کے ذریعے حق کا ابطال یا باطل کا احقاق کیا گیا ہو' وہ مکروہ ہے اور مکروہ ان کے نزدیک حرام کے قریب تر ہوتا ہے'' (فتح الباری 'کتاب الحیل)۔ امام محمدؒ کے دوسرے شاگرد ابو سلیمان جوزجانی نے ان کا یہ قول بھی نقل کیا ہے: ''کتاب الحیل ہماری کتابوں میں سرے سے شامل ہی نہیں ہے'' (اعلاء السنن ج ۱۸' ص ۴۳۲)۔

اس مختصر سی بحث سے ثابت ہوا کہ حیلوں سے حرام' حلال نہیں ہو سکتا اور اس قسم کے حیلے کرنا اسلامی اخلاق کا تقاضا نہیں ہے۔

شریعت کا ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ جائز اور مباح کام اگر حرام کا ذریعہ بنتا ہو اور حرام کا راستہ کھولتا ہو تو وہ ممنوع اور ناجائز ہوتا ہے۔ اس کو قاعدہ سدا الذریعہ کہا جاتا ہے۔ حیل ربویہ اور سودی حیلے چونکہ سود کا راستہ کھولنے کا ذریعہ بنتے ہیں اس لیے ان کا سدباب ضروری ہے۔

سود کے جواز کے لیے جو حیلے پیش کیے جا رہے ہیں ہم ان کا ایک جائزہ پیش کرتے ہیں۔

۱۔ سونے کی قیمت کو معیار بنانا

بعض لوگوں نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ کرنسی نوٹوں کے قرض لین دین میں سونے کی قیمت کو معیار بنایا جائے۔ یعنی قرض دیے گئے نوٹوں کے بدلے میں سونے کی جتنی مقدار ملتی ہو واپسی کے وقت نوٹوں کی مقدار سونے کی اسی مقدار کی قیمت کے برابر ہونی چاہیے۔ مثلاً آج کسی کو پانچ ہزار روپے قرض دیے گئے جس کے بدلے میں ایک تولہ سونا ملتا ہے لیکن ادائیگی کے وقت ایک تولے کی قیمت چھ ہزار ہو گئی تو چھ ہزار روپے دینے ہوں گے۔ [وہ کہتے ہیں کہ] یہ ربا اس لیے نہیں ہو گا کہ ایک تولے کی قیمت کے برابر نوٹ لیے تھے اور ایک تولے ہی کی قیمت کے برابر نوٹ واپس کیے گئے ہیں۔ یہ ہے اس حیلے کا مفہوم جسے کچھ لوگ افراط زر اور طلب و رسد کے عدم توازن کی وجہ سے کرنسی نوٹوں کی قوت خرید میں کمی کا علاج سمجھتے ہیں۔

درحقیقت نقود و رقیہ یعنی کاغذی نوٹوں کے ساتھ اب سونے کا کوئی قانونی تعلق باقی نہیں رہا بلکہ یہ

مستقل طور پر مال مثلی اور ثمن عرفی کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں اور سونے چاندی کے قائم مقام بن چکے ہیں اس لیے اس حیلے کے ذریعے پانچ ہزار دے کر چھ ہزار لینا اسی طرح کا سود ہو گا جس طرح کہ ایک تولہ سونا قرض دے کر سوا تولہ واپس لینا' یا ایک من گندم قرض دے کر ڈیڑھ من لینا سود ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ نوٹوں کی قیمت میں کمی ہو گئی ہے تو ہم فقہا کا یہ قاعدہ بیان کر چکے ہیں کہ قرض کی واپسی میں جنس اور مقدار میں برابری ضروری ہوتی ہے یعنی جتنا اور جیسا لیا تھا' اتنا ہی اور ویسا ہی واپس کرنا ہو گا۔ قیمت اور قوت خرید میں برابری اور مثلیت ضروری نہیں ہوتی۔ قوت خرید میں کمی بیشی تو سونے چاندی کے سکوں اور گندم و چاول میں بھی ہوتی ہے' لیکن ان میں کوئی نہیں کہتا کہ قرض کی ادائگی قیمت کے اعتبار سے کی جائے بلکہ سب کہتے ہیں کہ ادائگی جنس اور مقدار کے اعتبار سے کی جائے۔ جب ثمن خلقی یعنی سونے چاندی کے سکوں میں مثلیت اور برابری قیمت اور قوت خرید کے اعتبار سے نہیں' بلکہ مقدار کے اعتبار سے ملحوظ رکھی جاتی ہے تو ثمن عرفی اور زر قانونی یعنی کرنسی نوٹوں میں قوت خرید کے اعتبار سے مثلیت اور برابری کو کیوں ضروری سمجھا جاتا ہے؟ جب کہ یہ سونے چاندی کے سکوں کے قائم مقام ہیں۔

اس حیلے سے سود کا دروازہ کھل جائے گا۔ اگر مقصد کرنسی نوٹوں کو سونے کے ساتھ نتھی کرنا تھا اور واپسی سونے کی قیمت کے اعتبار سے کرنی تھی تو پھر اس حیلے کی کیا ضرورت تھی' سیدھے طریقے سے سونا دے کر سونا ہی واپس لیا جاتا۔ آج کل جو لوگ نوٹوں کا قرض لین دین کرتے ہیں ان کے ذہن میں یہ بات نہیں ہوتی کہ وصولی اور ادائگی سونے کی قیمت کے حساب سے کی جائے گی' حالانکہ ان کو علم ہوتا ہے کہ نوٹوں کی قیمت میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود نوٹوں کا قرض لین دین کرتے ہیں اس لیے کہ لوگ جانتے ہیں کہ اگر نوٹ ان کے جیب یا الماری میں موجود ہوتے' پھر بھی ان کی قوت خرید میں جو کمی آنی تھی وہ آ جاتی۔ جو نوٹ جیب میں رکھنے کے بجائے کسی کو قرض حسن دیے گئے ہوں' ان کی قوت خرید میں بھی جو کمی آنی تھی وہ آ گئی ہے۔ جس میں نہ قرض لینے والے کا کوئی قصور ہے اور نہ قرض دینے والے کا کوئی قصور ہے بلکہ یہ حالات اور طلب و رسد کے درمیان عدم توازن کا تقاضا ہے۔ یہ عدم توازن مصنوعی ہو یا فطری' اسے صبر و شکر کے ساتھ برداشت کر لینا چاہیے اور آیندہ کے لیے طلب و رسد کو متوازن بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

۲۔ اشیاے صرف کی قیمتوں کو معیار بنانا

افراط زر کی وجہ سے کرنسی نوٹوں کی قیمت میں کمی کی تلافی کے لیے اشاریہ بندی (indexation) کی تجویز بھی بار بار دہرائی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اشیاے صرف اور ضروریات زندگی کی قیمتوں کو معیار بنا کر قرض کا لین دین کیا جائے اور تمام حقوق و واجبات میں قیمتوں میں اضافے کے تناسب سے اضافہ کر دیا جائے۔ اگر چیزوں کی قیمتوں میں دس فی صد اضافہ ہوا ہے تو قرض اور دوسرے واجبات میں بھی دس

فی صد اضافہ کر دیا جائے یعنی ایک ہزار کے بدلے میں گیارہ سو دیے جائیں۔ اگر قیمتوں میں ۵۰ فی صد اضافہ ہوا ہے تو ادائیگی بھی ۵۰ فی صد اضافے کے ساتھ کی جائے یعنی ایک ہزار کے بدلے میں ڈیڑھ ہزار۔

اشاریہ بندی کی یہ تجویز بھی سودی حیلوں میں سے ایک حیلہ ہے جو قرض کے بارے میں شرعی قاعدے سے متصادم ہے' اس لیے کہ کرنسی نوٹ کی حیثیت اب رسید کی نہیں ہے بلکہ یہ ایک زر قانونی اور ثمن عرفی ہے جو سونے چاندی کے سکوں کی جگہ لے چکا ہے۔ سونے چاندی یا دوسرے اموال ربویہ کے نقد تبادلے میں بھی قیمت اور مالیت کا کوئی اعتبار نہیں ہے بلکہ مقدار میں برابری ضروری ہے تو قرض اور ادھار میں قیمت کو کس طرح معیار بنایا جا سکتا ہے؟ اگر بیع صرف کے طور پر خالص چاندی کا ایک درہم دو کھوٹے درہموں کے بدلے میں فروخت کیا جائے یا خالص سونے کا ایک دینار دو کھوٹے دیناروں کے بدلے میں فروخت کیا جائے تو یہ ربا الفضل ہے اور حرام ہے۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے کے بدلے سونے اور چاندی کے بدلے چاندی کے مبادلے میں برابر برابر ہونا مطلقاً شرط قرار دیا ہے اور کھرے کھوٹے کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا۔ ایک حدیث میں تو صریح الفاظ میں فرمایا گیا ہے کہ "جید اور ردی دونوں برابر ہیں" (بدایہ کتاب البیوع باب الربا)۔ علامہ زیلعیؒ (م ۷۶۲ھ) اور علامہ بدر الدین عینیؒ (م ۸۵۵ھ) نے لکھا ہے کہ: "یہ حدیث اگرچہ غریب ہے لیکن اس کا مفہوم حضرت ابو سعید خدریؓ کی حدیث سے بھی اخذ کیا جا سکتا ہے" (نصب الرایہ اور البنایہ 'باب الربا)۔

حضرت ابو سعیدؓ کی جس حدیث کا حوالہ زیلعی اور عینی نے دیا ہے اس میں مثلاً بمثل کے بعد وزناً یوزن کا لفظ بھی آیا ہے۔ ابن الہمامؒ نے فرمایا ہے کہ مثلاً لفظ عام ہے اس لیے وزناً کا اضافہ کیا گیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ تماثل اور برابری مقدار میں ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "برنی" اور "جنیب" یعنی عمدہ کھجور کی ایک صاع کے بدلے میں گھٹیا قسم کی کھجور کے دو صاع لینے دینے کو سود قرار دیا ہے' حالانکہ ان کی مالیت اور قوت خرید میں بڑا فرق ہوتا ہے (فتح القدیر)۔ انھی دلائل کی بنا پر فقہاے اسلام کا اس پر اجماع ہے کہ "اموال ربویہ" میں جید اور ردی دونوں برابر ہیں الا یہ کہ درہم و دینار کا کھوٹ اور غش خالص چاندی اور سونے سے زیادہ ہو تو اس صورت میں درہم و دینار کی حیثیت عروض یعنی اشیاے استعمال اور سامان کی ہو گی جس کی بیع میں تماثل اور برابری شرط نہیں ہے بلکہ کمی بیشی بھی جائز ہے۔ اس لیے خالص چاندی کا ایک درہم دو ایسے درہموں کے بدلے میں فروخت کیا جا سکتا ہے جس کا کھوٹ چاندی کی مقدار سے زیادہ ہو (بدائع 'ج ۵' ص ۲۲۰)۔

جب کرنسی نوٹ سونے چاندی کے سکوں کی جگہ لے چکے ہیں تو ان کے قرض لین دین میں بھی قیمت کا اعتبار نہیں ہو گا بلکہ مقدار اور جنس کا اعتبار ہو گا یعنی جس مالیت کے جتنے نوٹ دیے تھے' اسی مالیت کے اتنے ہی نوٹ واپس کرنے ہوں گے۔

اشاریہ بندی کی بنیاد پر قرض کی ادائیگی میں دوسری خرابی یہ ہے کہ قرض کی ادائیگی پہلے سے متعین مقدار کے مطابق کرنا لازم ہے اور اشاریہ بندی میں مقدار کا تعین تخمینی اور قیاسی طریقے پر ادائیگی کے وقت کیا جاتا ہے اس لیے کہ قرض لیتے وقت معلوم نہیں کہ قیمتوں میں اضافہ کتنا ہو گا اور کن کن چیزوں کی قیمت بڑھے گی؟ ان وجوہات کی بنا پر اسلامی بنک کاری اور اسلامی شریعت دونوں کے ماہرین نے اشاریہ بندی کی تجویز کو مسترد کر دیا ہے اور متعدد بین الاقوامی سیمی ناروں میں یہ طے ہو چکا ہے کہ یہ شرعی قواعد سے متصادم ہے اور افراط زر کے مسئلے کا حل بھی نہیں ہے۔

بعض لوگوں نے اشیاے صرف کی قیمتوں کے تناسب سے قرض کی مقدار میں اضافہ کرنے (اشاریہ بندی) کے لیے امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد قاضی ابویوسفؒ کی رائے کو دلیل بنایا ہے جن کی رائے آخر میں یہ بنی تھی کہ فلوس یعنی سونے چاندی کے علاوہ دوسرے دھاتی سکوں کی قیمت میں اگر کمی بیشی ہو گئی ہو تو قرض کی ادائیگی فلوس کی اس قیمت کے مطابق کی جانی چاہیے جو قرض لینے کے وقت یا بیع کے وقت تھی۔ کرنسی نوٹ بھی چونکہ فلوس کی طرح ثمن عرفی ہیں' ثمن خلقی نہیں ہیں' اس لیے ان کے لین دین میں بھی مقدار کی بجائے قیمت اور قوت خرید کو معیار بنانا چاہیے۔ سودی حیلوں کے عادی لوگوں کو اگر تقلید ہی کرنی تھی تو بہتر یہ تھا کہ امام ابوحنیفہؒ' امام شافعیؒ' امام مالکؒ اور امام احمدؒ کی تقلید کر لیتے' جن کی رائے یہ ہے کہ فلوس جب تک مارکیٹ میں بطور ثمن چل رہے ہوں (نافق ہوں کاسد نہ ہوں) اس وقت تک ادائیگی بالمثل ضروری ہو گی۔ یعنی جتنے سکے بطور قرض یا بطور ثمن واجب الادا تھے اتنے ہی واپس کرنے ہوں گے اور قوت خرید میں کمی بیشی کی وجہ سے واجب الادا فلوس کی مقدار میں کمی بیشی جائز نہیں ہو گی۔ البتہ اگر دھاتی سکے کاسد ہو گئے ہوں یعنی بازار میں ان کا چلن بالکل ختم ہو گیا ہو تو پھر قرض لیتے وقت یا بیع کے وقت ان کی جو قیمت تھی اس کے اعتبار سے مروجہ سکوں میں ادائیگی کی جائے گی۔ اس لیے کہ بطور ثمن ان کا چلن ختم ہونے کی وجہ سے ان کی حیثیت سامان تجارت کی ہو گئی ہے جیسے تانبا' لوہا اور چاندی وغیرہ (بدائع' شرح المہذب' المدونہ اور المغنی)۔

دوسری بات یہ ہے کہ امام ابویوسفؒ نے جس بنیاد پر ادائیگی بالقیمت کا فتویٰ دیا تھا وہ یہ تھی کہ فلوس کا تعلق اس دور میں سونے اور چاندی کے ساتھ تھا اور یہ درہم کی ریزگاری تھی' مثلاً درہم اگر دس فلوس کا ہو تو ایک فلس درہم کا دسواں حصہ بنتا ہے۔ اس اعتبار سے دس فلوس قرض لینا ایک درہم قرض لینے کے برابر ہے اور جب فلوس کی قیمت میں کمی آ جائے تو اس صورت میں دس فلوس ہی واپس کرنے کا مطلب یہ ہو گا کہ درہم کا دسواں حصہ کم دیا ہے' اور گیارہ فلوس دینے کے معنی یہ ہیں کہ جو درہم لیا تھا' وہی پورے کا پورا واپس کر دیا ہے۔ اس لیے کہ فلوس درہم کے اجزا اور ریزگاری کی حیثیت رکھتے تھے' مستقل ثمن کی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ یہ اصل میں نادار اور تنگ دست لوگوں کے لیے بنائے جاتے تھے

تاکہ وہ ان کے بدلے میں اپنی ضرورت کی چھوٹی موٹی چیزیں خرید سکیں کیونکہ سونے چاندی کے سکے یعنی درہم اور دینار قیمتی چیزوں کی خریداری کے لیے یا زیادہ مقدار میں خریداری کرنے کے لیے استعمال ہوتے تھے جو تنگ دست اور نادار لوگوں کے پاس نہیں ہوتے تھے۔ لیکن کرنسی نوٹوں کی حیثیت اب سونے چاندی کی رسید اور وثیقے کی نہیں ہے اور یہ درہم و دینار کے اجزا اور ریزگاری بھی نہیں ہیں بلکہ مستقل طور پر ثمن عرفی اور زر قانونی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے جب تک یہ منسوخ نہ ہوئے ہوں اور ان کا چلن بالکل ختم نہ ہوا ہو اس وقت تک ان کی ادائیگی بالمثل ضروری ہوگی یعنی جتنے لیے تھے اتنے ہی واپس کرنے ہوں گے۔

ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاے اسلام کے مقابلے میں امام ابو یوسفؒ کے قول ثانی کو ترجیح دینا مناسب نہیں ہے، جب کہ ان کا پہلا قول ائمہ اربعہ کی رائے کے مطابق تھا۔ اگر ان کی رائے کو ترجیح دی بھی جائے، جیسا کہ علامہ شامیؒ نے بعض حنفی فقہا کے حوالے سے کہا ہے کہ فتویٰ ابو یوسفؒ کے قول ثانی پر دیا گیا ہے، پھر بھی آج کل کے کرنسی نوٹوں کو فلوس پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ دونوں کے درمیان فرق ہے۔ پاکستان کی اسلامی نظریاتی کونسل کا متفقہ فیصلہ بھی یہی ہے کہ اشیا کی قیمتوں کو قرض لین دین یعنی اشاریہ بندی کی شریعت میں کوئی گنجایش اور وجہ جواز موجود نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ۱۴۰۷ھ میں اسلامی ترقیاتی بنک جدہ اور بین الاقوامی ادارہ برائے اسلامی اقتصادیات اسلام آباد دونوں کے زیر اہتمام جو سیمی نار منعقد ہوا تھا جس میں مختلف ممالک کے ماہرین شریعت اور ماہرین معیشت نے شرکت کی تھی، اس کا متفقہ فیصلہ بھی یہی تھا کہ: "کرنسی نوٹ تمام معاملات میں درہم اور دینار کی طرح ہیں اور امام ابویوسفؒ کا فلوس کے بارے میں یہ قول کہ ان کی قیمت میں کمی بیشی کی صورت میں قرضوں کی ادائیگی اسی قیمت کے تناسب سے کی جائے گی، کرنسی نوٹوں میں جاری نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ یہ کرنسی نوٹ نقدین (درہم و دینار) کے قائم مقام ہیں اور نقدین کی قیمت بڑھنے اور گھٹنے کا معتبر نہ ہونا متفق علیہ ہے۔ سود اور قرض کی احادیث میں مثلیت اور برابری سے جنس اور قدر یعنی ناپ تول اور عدد میں برابری مراد ہے، قیمت میں برابری مراد نہیں ہے۔ یہ بات اموال ربویہ کے تبادلے سے متعلق احادیث سے پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ اسی پر امت کا جماع ہے اور اسی پر عمل جاری ہے، ہر قسم کے دیون کو قیمتوں کے اشاریہ کے ساتھ منسلک کرنا جائز نہیں" (فقہی مقالات از مولانا جسٹس محمد تقی عثمانی، ج ۱، ص ۷۲ ملخصاً)۔

جب سود کا شرعی اور حلال متبادل موجود ہے تو اشاریہ بندی کے اس سودی حیلے پر آخر کیوں اصرار کیا جا رہا ہے، جب کہ اسے ماہرین شریعت نے مسترد کر دیا ہے اور ماہرین معیشت کے نزدیک بھی یہ افراط زر کا حل نہیں ہے۔

۳۔ قرض کی واپسی جنس کی صورت میں طے کرنا

بعض حلقوں کی جانب سے یہ تجویز پیش کی جاتی ہے کہ قرض کی واپسی جنس کی صورت میں کی جائے' مثلاً دس ہزار روپے کے نوٹ دیتے وقت یہ طے کر لیا جائے کہ ادائیگی کے وقت دس ہزار روپے کی جتنی گندم ملتی ہو' وہ دی جائے گی' اس طرح کرنسی کی قیمت میں کمی کی تلافی ہو جائے گی۔ لیکن یہ تجویز بھی ایک قسم کا سودی حیلہ ہے۔ یہ تین وجوہات کی بنا پر شرعی قواعد سے متصادم ہے۔ اول: قرض کی واپسی بالمثل ضروری ہے اور اس تجویز میں نوٹوں کے بدلے میں گندم یا کوئی اور جنس دینا طے کیا جاتا ہے۔ دوم: واجب الادا قرض کی مقدار کا پہلے سے تعین ہونا ضروری ہے اور اس تجویز کی رو سے اس جنس کی مقدار کا پہلے سے تعین نہیں ہو سکتا اور ادائیگی کے وقت بھی مقدار کا تعین نزاع کا ذریعہ بن سکتا ہے اس لیے کہ مختلف علاقوں اور شہروں بلکہ دکانوں کے نرخ بھی الگ الگ ہو سکتے ہیں۔ سوم: ادھار گندم کے بدلے میں پیشگی رقم دینا بیع سلم کی طرح کا معاملہ ہے مگر اسے نام دیا گیا ہے قرض کا' حالانکہ دونوں کے درمیان فرق ہے کہ بیع میں نفع جائز ہے اور قرض پر نفع لینا حرام ہے۔ دو قسم کے معاہدے ایک ہی چیز میں بیک وقت نہیں کیے جا سکتے۔ اگر دس ہزار روپے قرض دیے گئے ہیں تو ادائیگی بالمثل کرنی ہو گی' یعنی دس ہزار روپے کے نوٹ واپس کرنے ہوں گے۔ اگر یہ رقم گندم کی قیمت ہے تو پھر بیع سلم کی شرائط پوری کرنی ہوں گی جن میں سے ایک شرط یہ ہے کہ جنس اور قیمت دونوں کی مقدار معاہدے کی مجلس میں متعین کی جائے۔ لہٰذا یہاں گندم کی مقدار ادائیگی کے وقت متعین کی جائے گی۔

۴۔ احسان کے بدلے احسان کی تدبیر

بعض لوگوں نے سود کے متبادل کے طور پر "حسن القضا" کے نام سے ایک نظام بنانے کی تجویز پیش کی ہے جس کا خاکہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ بنک چھ ماہ یا ایک سال یا کم و بیش مدت تک کھاتہ داروں کی رقوم استعمال کرنے کے بعد ان کو احسان کے بدلے احسان کے طور پر کچھ اضافی رقم ادا کرے۔ اضافی رقم کی مقدار کا تعین کرتے وقت مجموعی قومی آمدنی میں اضافے کو' افراط زر کی وجہ سے کرنسی کی قیمت میں کمی کو' اور کاروبار میں نفع کے تناسب کو ملحوظ رکھا جا سکتا ہے۔ اس اضافی رقم کا اعلان ہر مالی سال کے اختتام پر کیا جانا چاہیے مگر ساتھ یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ یہ اضافی رقم قرض کا نفع نہیں ہے بلکہ "حسن القضا" کے نظام کے تحت دیا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک حیلہ ہے جو سود کو احسان و انعام کے نام سے جاری رکھنے کے لیے پیش کیا گیا ہے۔

جو چیز مروج اور معروف ہو چکی ہو' اس کا حکم وہی ہوتا ہے جو مشروط چیز کا ہوتا ہے۔ چونکہ قرض پر مشروط اضافہ جائز نہیں ہے تو معروف اضافہ بھی جائز نہیں ہے۔ جب قرض پر اضافی رقم دینے کا باقاعدہ نظام بنایا جائے' اس کا اعلان کیا جائے اور یہ بنکوں اور کھاتہ داروں کے درمیان معاہدے کے بغیر ایک معمول بن جائے تو یہ کالمشروط نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ اس نظام کے تحت جو بھی قرض دے گا تو اسی نیت سے

دے گا کہ مجھے انعام کے نام پر کچھ اضافہ بھی ملے گا۔ جب یہ معاشرے کا رواج بن جانے کا تو عملاً یہ ایک غیر تحریری قانون بن جائے گا جس پر عدالتیں فیصلہ بھی کریں گی۔ "حسن القضا" کی احادیث کا مفہوم تو یہ ہے کہ شرط اور عرف و رواج کے بغیر مدیون دائن کو بطور احسان کچھ زائد رقم دے دے تو یہ جائز ہے بلکہ بہتر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگ سود کے عادی ہو چکے ہیں اس لیے حیلوں' بہانوں اور چور دروازوں کے ذریعے اسی ظالمانہ نظام کو بحال رکھنا چاہتے ہیں اور ان کو ایسے نام نہاد دانشور اور وکیل بھی مل جاتے ہیں جو انھیں حیلے اور چور دروازے بتاتے رہتے ہیں۔

۵۔ قرض دینے والوں کو سرکاری واجبات اور ٹیکسوں میں رعایت دینا

یہ تجویز بھی پیش کی جاتی ہے کہ قرض دینے کا رجحان بڑھانے اور ترغیب دلانے کے لیے قرض دینے والوں کو ٹیکسوں اور دوسرے سرکاری واجبات میں ایک مخصوص حد تک رعایت دی جائے۔ یہ بھی رعایت اور ترغیب کے نام پر ایک سودی حیلہ ہے جو ایجاد کیا گیا ہے۔

ٹیکس اور سرکاری واجبات اگر ظالمانہ ہوں تو ان کو ختم کرنا ضروری ہے اور کسی سے بھی وصول کرنا جائز نہیں لیکن اگر عادلانہ ہوں تو قرض دینے والوں کو ان میں چھوٹ اور رعایت دینا دراصل قرض کے بدلے میں نفع پہنچانا ہے جو سود ہے۔ اگر کسی کو اس کی اقتصادی حالت یا اس کی قومی اور ملی خدمت کی وجہ سے واجبات میں رعایت دی گئی ہو تو یہ انعام یا اعانت ہے اور جائز ہے' لیکن جب اسے یہ رعایت قرض دینے کی وجہ سے دی گئی ہو تو نہ یہ انعام ہے اور نہ اعانت بلکہ ربا ہے۔ دائن کا اپنے مدیون سے تحفہ لینا بھی جائز نہیں ہے' جیسا کہ حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا: "تم میں سے کوئی شخص اپنے کسی بھائی کو قرض دے' پھر اس کا مقروض اسے کھانے کا خوانچہ تحفے کے طور پر بھیجے تو وہ اسے قبول نہ کرے یا وہ اپنی سواری پر سوار کرنا چاہے تو اس پر سواری نہ کرے' سوائے اس صورت کے کہ ان دونوں کے درمیان پہلے سے ہدیہ لینے دینے کے تعلقات جاری ہوں" (ابن ماجہ' کتاب الصدقات باب القرض)۔

حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے حضرت ابوہریرہؓ کے بیٹے سعید کو کہا تھا کہ: "جب تمھارا کسی پر کوئی حق ہو اور وہ تمھیں گھاس یا جو کا یا چارے کا کوئی گٹھا تحفے کے طور پر بھیجے تو اسے قبول نہ کرو کیونکہ یہ بھی سود ہے" (بخاری ' باب مناقب عبداللہ بن سلام)۔ جب تحفہ لینا دینا جائز نہیں ہے تو واجبات میں چھوٹ اور رعایت لینا دینا کس طرح جائز ہو سکتا ہے؟

۶۔ کرنسی نوٹوں کا زیادہ قیمت پر فروخت کرنا

بعض لوگوں نے سودی سکیموں کو نئے نام سے جاری رکھنے کے لیے یہ حیلہ نکالا ہے کہ نوٹوں کو زیادہ

قیمت پر فروخت کیا جائے' مثلاً ۱۰ ہزار کے نوٹ ۱۲ ہزار کے عوض اور ۱۰ لاکھ کے نوٹ ۱۲ لاکھ کے عوض مانگنے والے پر ادھار فروخت کر دیے جائیں' مگر اسے قرض کا نام نہ دیا جائے۔ اس طرح یہ ۲ ہزار یا ۲ لاکھ قرض پر اضافہ نہیں ہو گا بلکہ نوٹوں کی قیمت فروخت میں اضافہ ہو گا جو حلال ہے۔ اس کی دلیل یہ پیش کی گئی ہے کہ نوٹوں کا حکم فلوس کی طرح ہے اور امام شافعیؒ کا مسلک اور امام احمدؒ کا ایک قول یہ ہے کہ ایک سکے کو دو سکوں کے بدلے میں بیچنا جائز ہے۔ اس لیے کہ فلوس میں ثمنیت عرفی ہے' خلقی نہیں ہے اور ربا الفضل کی حرمت خلقی اثمان یعنی سونے چاندی کے ساتھ مخصوص ہے۔ لہٰذا فلوس کا تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ جائز ہے (نہایۃ المحتاج از علامہ رملیؒ' ج ۳' ص ۴۱۷ اور فتاویٰ ابن تیمیہ' ج ۲۹' ص ۴۶۰)۔

امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کی رائے یہ ہے کہ فلوس کا کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ جائز ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ بائع اور مشتری میں سے کسی ایک نے بیع و شراء کی مجلس میں الگ ہونے سے پہلے اپنے فلوس پر قبضہ کر لیا ہو۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک فلوس کا تعلق قبضے کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ جب کسی ایک نے بھی قبضہ نہ کیا ہو تو یہ ادھار کی بیع ادھار سے ہو گی جو ممنوع ہے۔ مگر امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد امام محمدؒ کا مسلک یہ ہے کہ فلوس جب تک بازار میں چل رہے ہوں تو ان کا تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ جب تک ان سکوں کا بطور ثمن چلن ختم نہ ہو جائے اس وقت تک صرف بائع و مشتری ان کی ثمنیت کو باطل کر کے ان کو عروض اور سامان کی حیثیت نہیں دے سکتے بلکہ ان کے ثمن اصطلاحی کی حیثیت برقرار رہے گی اور اثمان کا باہمی تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ جائز نہیں ہے۔ اس لیے ایک سکے کا دو سکوں سے تبادلہ جائز نہیں ہے (فتح القدیر' باب الربا)۔

دلائل کے اعتبار سے امام محمدؒ اور امام مالکؒ کی رائے مضبوط ہے۔ اس لیے کہ جب فلوس میں ثمنیت عرف عام اور رواج عام کی وجہ سے آئی ہے تو اسے عرف عام ہی ختم کر سکتا ہے' دو یا چند افراد ختم نہیں کر سکتے۔ لیکن اگر دوسری رائے کو ترجیح دے دی جائے پھر بھی اس کا اطلاق کرنسی نوٹ پر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ یہ نوٹ اب مستقل طور پر زر قانونی اور ثمن عرفی بن چکے ہیں۔ اور درہم و دینار کی جگہ لے چکے ہیں اس لیے ۱۰ ہزار نوٹوں کا تبادلہ ۱۲ ہزار نوٹوں کے ساتھ کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ ۱۰ ہزار درہم کو ۱۲ ہزار کے بدلے میں فروخت کرنا۔ ظاہر ہے کہ یہ تو عین ربا ہے۔

یہ حیلہ دوسرے حیلوں سے زیادہ خطرناک ہے۔ اس لیے کہ جو شخص بھی سود پر قرض دینا چاہتا ہو وہ اپنے کرنسی نوٹ زیادہ قیمت میں فروخت کر کے بڑی آسانی سے سود حاصل کرے گا۔ اس طرح سود کا دروازہ چوپٹ کھل جائے گا۔ البتہ مختلف ممالک کی کرنسیوں کی خرید و فروخت کمی بیشی کے ساتھ جائز ہے۔ مثلاً پونڈ کو ۸۰ روپے میں بیچنا' ڈالر کو ۵۰ روپے میں فروخت کرنا اور اسی طرح دوسرے نوٹوں کا پاکستانی کرنسی کے ساتھ تبادلہ کرنا جائز ہے۔ اس لیے کہ مختلف ملکوں کی کرنسیاں مختلف اجناس ہیں۔

۷۔ بیع عینہ

سودی ذہنیت رکھنے والے سوداگروں نے بیع کے نام سے ایک اور حیلہ ایجاد کیا ہے جس کو "بیع عینہ" کہتے ہیں۔ اس کی فقہی تعریف یہ ہے: "بیع عینہ یہ ہے کہ کسی چیز کو ادھار قیمت پر فروخت کیا جائے، پھر لوٹ کر اسی چیز کو خریدار سے کم قیمت پر خرید لیا جائے" (نصب الرایہ ج ۴، ص ۱۶)۔

اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص نے کسی سودی ذہنیت والے تاجر سے ۴ ماہ کے لیے سو روپے قرض حسن مانگا۔ اس نے قرض دینے کے بجائے سو روپے کا ایک کپڑا ۱۱۸ روپے ادھار میں فروخت کر دیا۔ جب خریدار نے اس کو قبضے میں لے لیا تو اسی تاجر نے وہی کپڑا اس سے سو روپے نقد دے کر واپس خرید لیا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں کپڑے کی خرید و فروخت مقصد نہیں ہے بلکہ قرض لین دین کا معاملہ اصل مقصد ہے۔ قرض مانگنے والے کو سو روپے کی ضرورت ہے اور دینے والے کو سو روپے پر ۱۸ روپے سود لینے کی خواہش ہے۔ اس لیے انھوں نے عقد بیع کو سودی لین دین کا ایک ذریعہ اور حیلہ بنایا ہے۔ کپڑا واپس تاجر کے پاس آگیا جسے وہ کسی اور خریدار کو فروخت کر کے اپنے سو روپے لے لے گا اور ۴ ماہ بعد ۱۱۸ روپے وصول کر لے گا۔ یہ فی الحقیقت سو روپے قرض پر ۱۸ روپے سود لینے دینے کا معاملہ ہے۔ ابن الہمامؒ نے اس کو عینہ کہنے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اس میں بعینہ وہی چیز بائع کے پاس لوٹ آتی ہے جو دی گئی تھی۔ ابن نجیمؒ نے اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی ہے کہ اس میں قرض مانگنے والے کو نقد روپے دینے کے بجائے ایک متعین چیز (عین) دی گئی ہے۔ بیع عینہ دراصل سود کا چور دروازہ ہے۔ اسی لیے رسولؐ اللہ نے فرمایا ہے کہ: "جب تم آپس میں بیع عینہ کرو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر ذلت مسلط کریں گے" (ابوداود باب النہی عن العینہ)۔ اس حدیث کی ابوداؤد کی سند اگرچہ ضعیف ہے لیکن امام احمدؒ کی کتاب الزھد میں یہ صحیح سند کے ساتھ بھی نقل ہوئی ہے (نصب الرایا، ج ۴، ص ۱۶-۱۷)۔

بیع عینہ کے ممنوع ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ: "حضرت عائشہؓ کے پاس کوفہ کی ایک عورت آئی اور پوچھا کہ میں نے حضرت زیدؓ بن ارقم کو ایک کنیز ۸ سو روپے ادھار میں فروخت کی تھی اور پھر وہی کنیز ان سے ۶ سو روپے نقد میں واپس خرید لی۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا: تم دونوں نے برا کام کیا ہے۔ میرا یہ پیغام زیدؓ بن ارقم کو پہنچا دو کہ تم نے رسولؐ اللہ کے ساتھ جو حج اور جہاد کیا تھا وہ ضائع کر دیا الا یہ کہ وہ اس سے توبہ کر لیں (مصنف عبدالرزاق، ج ۸، ص ۱۸۵)۔ یہ حدیث مسند احمد اور سنن کبریٰ للبیہقی میں بھی نقل ہوئی ہے۔ علامہ جمال الدین زیلعیؒ نے اس کی سند کو جید کہا ہے اور ضعیف کہنے والوں کے اعتراضات کا جواب دیا ہے (نصب الرایا، ج ۴، ص ۱۵-۱۶)۔

مذکورہ روایات کی بنا پر امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ نے بیع عینہ کو ممنوع قرار دیا ہے (الجوہر النقی فی ذیل البیہقی، ج ۵، ص ۳۳۰)۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ میرے دل میں اس بیع سے

نفرت پہاڑوں کی طرح ہے۔ یہ ایک مذموم بیع ہے جس کو سود خوروں نے گھڑ لیا ہے اور رسولؐ اللہ نے اس کی مذمت کی ہے (فتح القدیر' ج ۷' باب الکفالہ ص ۲۱۲-۲۱۳)۔ امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ اگر ادھار فروخت کرتے وقت دوبارہ کم قیمت پر خریدنے کی شرط نہیں لگائی گئی تھی تو اس صورت میں بیع عینہ جائز ہے کیونکہ جب مشتری خریدی ہوئی چیز کا مالک بن گیا ہو تو اپنی دوسری املاک کی طرح اسے بھی جتنی قیمت پر اور جیسے چاہے فروخت کر سکتا ہے۔ عینہ کی مذمت کی احادیث ان کے نزدیک ضعیف ہیں (مختصر المزنی فی آخر کتاب الام' ص ۸۵)۔ لیکن شافعیہ میں سے ابو اسحٰق اسفرائینیؒ اور شیخ ابو محمدؒ نے فرمایا ہے کہ: "جب اس قسم کی بیع لوگوں کی عادت بن جائے اور مروج ہو جائے تو بیع ثانی' بیع اول کے وقت مشروط کی طرح ہو جاتا ہے اور دونوں باطل ہو جاتے ہیں" (روضۃ الطالبین' ج ۳' ص ۸۲)۔

معلوم ہوا کہ عینہ کا یہ حیلہ جب معروف ہو جائے اور لوگوں کا معمول بن جائے تو المعروف کالمشروط کے قاعدے کی وجہ سے شافعیہ کے نزدیک بھی باطل ہو گا اور اس صورت میں چاروں ائمہ کے نزدیک ممنوع ہو گا۔ حنفیہ میں سے امام ابو یوسفؒ بھی جواز کے قائل ہیں لیکن علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ امام ابو یوسفؒ سے جواز کی جو روایت آئی ہے وہ اس صورت کے بارے میں ہے کہ فروخت شدہ چیز دوبارہ لوٹ کر بائع کے پاس نہ آئے بلکہ خریدار نے نقد رقم حاصل کرنے کے لیے بازار میں کسی اور شخص پر جو بائع اول کا ایجنٹ اور کارندہ نہ ہو' کم قیمت میں فروخت کر کے اپنی مطلوبہ رقم نقد حاصل کر لی ہو۔ بعض اہل علم اس کو بھی بیع عینہ کہتے ہیں۔ امام ابو یوسفؒ نے اس قسم کی عینہ کو جائز کہا ہے اور امام محمدؒ نے جس قسم کی عینہ کی شدید مذمت کی ہے وہ یہ ہے کہ فروخت شدہ چیز دوبارہ کم قیمت پر واپس بائع کے پاس آ جائے (رد المحتار' ج ۴' ص ۳۸۷)۔ بہرحال بیع عینہ ایک "حیلہ ربویہ" ہے جس کو اختیار کرنے اور اس کے مطابق بنک کاری کا نظم چلانے سے سودی نظام بحال رہے گا۔

فقہ کی کتابوں میں مشائخ بلخ کا قول نقل ہوا ہے کہ بیع عینہ ان بیوع سے بہتر ہے جو آج ہمارے بازاروں میں رائج ہیں۔ اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ عینہ جائز ہے بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ عینہ سے زیادہ قباحت والے بیوع ہماری مارکیٹ میں رائج ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض مشائخ کے اقوال' احادیث و آثار اور ائمہ مجتہدین کی آرا کے مقابلے میں قابل اعتنا بھی نہیں ہو سکتے۔ جمہور فقہا کی مدلل رائے کو نظرانداز کر کے شاذ قسم کی آرا تلاش کرنا اور ان کو بطور دلیل پیش کرنا بحث و تحقیق کا صحیح طریقہ نہیں ہے۔

۸۔ بیع الوفا

سودی ذہنیت والوں نے رہن شدہ چیز سے نفع اور آمدن حاصل کرنے کے لیے "بیع الوفا" کے نام سے ایک حیلہ ایجاد کیا ہے جس کی تعریف یہ ہے: "بیع الوفا یہ ہے کہ بائع' خریدار سے کہے کہ میں نے یہ چیز تم پر فروخت کر دی ہے مگر شرط یہ ہے کہ میں جب ثمن (یعنی طے شدہ قیمت) واپس کروں گا تو یہ چیز دوبارہ

مجھے (اسی قیمت میں) فروخت کرو گے" (رد المحتار' ج ۴' ص ۳۴۱)۔

ابن عابدینؒ نے کفایہ شرح ہدایہ سے اس کی تعریف اس طرح نقل کی ہے کہ: "بیع الوفا یہ ہے کہ بائع' خریدار کو کہے کہ تیرا مجھ پر جو قرض ہے اس کے بدلے میں' میں نے یہ چیز تم کو فروخت کر دی ہے مگر شرط یہ ہے کہ جب بھی میں تیرا قرض ادا کر دوں تو یہ چیز دوبارہ میری ہو جائے گی۔

بہرحال الفاظ دوبارہ لوٹانے کے ہوں یا دوبارہ فروخت کرنے کے ہوں' دونوں کو "بیع الوفا" کہا جاتا ہے اس کا حکم کیا ہے؟ اس بارے میں مالکیہ' حنابلہ اور متقدمین حنفیہ اور شافعیہ کا مسلک تو یہ ہے کہ یہ بیع فاسد ہے۔ اس لیے کہ ثمن کی واپسی پر دوبارہ بائع کو فروخت کرنے کی شرط عقد بیع کے تقاضے کے خلاف ہے کیونکہ بیع کا تقاضا یہ ہے کہ مبیع کا مشتری کی ملکیت میں آ جانے کے بعد اس کو اختیار ہے کہ کسی کو فروخت کرے یا اپنے پاس ہی رکھے۔ فروخت کرنے کی صورت میں بھی اس پر یہ پابندی نہیں لگائی جا سکتی کہ جس سے خریدی تھی اسی کو فروخت کرو اور اسی قیمت پر فروخت کرو جو دی گئی تھی۔

اس کے علاوہ قاعدہ یہ ہے کہ عقود میں الفاظ کی بجائے مقاصد کو ملحوظ رکھا جاتا ہے اور اس بیع میں ثمن کی واپسی کے وقت فروخت شدہ چیز کی واپسی کی شرط لگانے سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ "رہن" ہے بیع نہیں ہے کیونکہ قرض کی ادائیگی کے وقت رہن شدہ چیز واپس کی جاتی ہے۔ فروخت شدہ چیز واپس نہیں کی جاتی۔ دراصل اس نام نہاد بیع کے پیچھے سودی حیلہ کارفرما ہے۔ "مرھونہ" [جسے رہن رکھا جائے] سے نفع حاصل کرنا چونکہ ربا ہے اور حرام ہے اس لیے حیلے کے طور پر "مرھونہ" کو مبیع کا نام دیا گیا ہے جس سے نفع حاصل کرنا ربح ہے اور حلال ہے۔ حنفیہ اور شافعیہ میں سے بعض متاخرین نے کہا ہے کہ بیع الوفا پر بیع کا یہ حکم تو مرتب ہوتا ہے کہ خریدنے والا خریدی ہوئی چیز سے نفع اٹھا سکتا ہے لیکن اس پر رہن کا حکم بھی مرتب ہوتا ہے کہ مشتری اسے بائع کے علاوہ کسی کو بیچ نہیں سکتا۔ اگرچہ یہ قواعد کے خلاف ہے لیکن لوگوں کے تعامل کی وجہ سے جائز ہے (الموسوعۃ الفقہیہ الکویتیہ' ج ۹' ص ۲۶۰' طبع کویت' ۱۹۸۷)۔

متاخرین میں سے سب نے نہیں بلکہ بعض نے جواز کی جو دلیل دی ہے وہ کمزور ہے اس لیے کہ تعامل اور عرف و رواج اگرچہ معتبر ہے لیکن حرام کو حلال کرنے کا حیلہ اگر عام ہو جائے اور لوگوں کا معمول بن جائے تو اس سے وہ حیلہ جائز نہیں ہو سکتا۔ عرف و تعامل پر مباحات اور مصالح مرسلہ سے تعلق رکھنے والے معاملات میں فیصلہ کیا جا سکتا ہے مگر محرمات و مکروہات تو ظاہر ہے کہ عرف و رواج سے جائز نہیں ہو سکتے۔ بیع الوفا کے بارے میں ابن نجیمؒ نے بحر الرائق' باب خیار الشرط میں آٹھ اقوال نقل کیے ہیں اور فتاویٰ بزازیہ' باب البیع الفاسد میں نو اقوال نقل کیے گئے ہیں لیکن یہ سب طول لاطائل اور بحث لاحاصل ہے۔ اس کا صحیح حکم دولت عثمانیہ کے ممتاز فقیہ شیخ بدر الدین بن قاضیؒ سماوہ (م ۸۱۸ھ) نے بیان

کیا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب جامع الفصولین کی فصل نمبر ۱۸ میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

"بیع وفا درحقیقت رہن ہے جس سے خریدی ہوئی چیز خریدار کی ملک میں داخل نہیں ہوتی اور نہ وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ الا یہ کہ مالک بطیب خاطر اور اپنی دلی رضامندی سے اسے فائدہ اٹھانے کی اجازت دے دے۔ اگر خریدار نے بیع وفا کے طور پر خریدے گئے باغ کا پھل کھایا ہو یا اس کا کوئی درخت ضائع کر دیا ہو تو وہ اس کے تاوان کا ذمہ دار ہو گا"۔

بائع جب قرض ادا کرے گا تو اپنی چیز واپس لے لے گا۔ ہمارے نزدیک بیع وفا اور رہن کے درمیان احکام کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے اس لیے کہ بائع اور مشتری دونوں نے اگرچہ اس کو بیع کا نام دیا ہے لیکن ان کا مقصد رہن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے زمانے میں بیع وفا کا معاملہ کرنے والے بعد میں لوگوں کے سامنے کہتے ہیں کہ میں نے اپنی فلاں چیز فلاں کے پاس رہن رکھ دی ہے اور خریدار کہتا ہے کہ میں نے فلاں سے اس کی فلاں چیز اپنے پاس گروی رکھ لی ہے۔ درحقیقت معاملات میں مقاصد و معانی معتبر ہوتے ہیں الفاظ اور حروف نہیں۔ جامع الفصولین کے محشی شیخ نجم الدین رملیؒ نے بھی شیخ بدرالدینؒ کی تائید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"بیع وفا درحقیقت رہن ہے اور اس کا حکم وہی ہے جو رہن کا ہے۔ محمد بن فضل بخاری نے بھی اسی طرح کہا ہے اور یہی صحیح ہے۔ اگرچہ بعض علما نے کہا ہے کہ یہ بیع فاسد ہے جو قبضہ مکمل ہونے کے بعد مشتری کی ملکیت کا موجب ہو جاتا ہے لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے (جامع الفصولین' ج ۱' ص ۲۳۴' طبع کراچی' ۱۴۰۲ھ)۔

سودی حیلوں کے زیر عنوان میں نے ۸ حیلے بطور نمونہ نقل کیے ہیں ورنہ سودی ذہنیت رکھنے والے قسم قسم کے حیلے بہانے گھڑتے رہتے ہیں۔ اللہ ہم سب پر رحم فرمائے آمین! (یہ تحریر سپریم کورٹ کی شریعت اپیلیٹ بنچ میں سود کے مسئلے پر حکومت کی اپیل کی سماعت کے موقع پر دیے گئے بیان کا ایک حصہ ہے)

پاکیزہ اور اصلاحی ادب کا علم بردار طالبات کا واحد ترجمان رسالہ
پکار کا خاص شمارہ "افسانہ نمبر" (مئی ۹۹ء)
رنگین صفحات اور دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ شائع ہو گیا ہے
خوب صورت افسانے' متنوع تحریریں' آج ہی حاصل کیجیے
صرف ۱۵ روپے میں
رابطہ دفتر : معرفت چغتائی الیکٹرک کنسرن' ۱۶۸ ۔ ملتان روڈ لاہور